

چلا جائے۔

لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کی خدمت میں جب کبھی ایسی بات پیش کیجئے، وہ عوام کے جذبات کو فوراً یہ کھکشتقل کر دیتے ہیں کہ بوجھئی! دیکھو، یہ کہتا ہے کہ (نعوذ باللہ) سب صحابہؓ جھوٹے تھے۔ اور رسول اللہ کی سب باتیں (معاذ اللہ) رطب و یابس ہیں۔ توبہ توبہ استغفر اللہ اتنا کبکرو خوش ہو جاتے ہیں کہ بس اب خدائی فوج اس لمحدوز نذیق کو زندہ نہ چھوڑے گی۔ لیکن وہ یقین مانیں کہ ان ملاحظہ و زنا و قہ کے اتصال کے بعد بھی قرآن زندہ رہے گا اور ہر اس چیز کو مٹا کر چھوڑے گا جو اس کے خلاف پڑے گی، خواہ اسے آپ ائمہ سلف کی طرف منسوب کر دیجئے خواہ خود نبی اکرم کی ذات مقدس کی طرف۔ اور اس کے بعد یا تو قرآن باقی رہے گا یا عمل متواتر (اسوہ حسنہ) جو یقینی دین ہے۔ لہذا ڈرنا چاہیے اس وقت سے جب یہ پوچھا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس میران کے یہ دو پلڑے موجود نہ تھے کہ تم حق و باطل کی تمیز کر سکتے۔ (باقی)۔

استدراک

جواب پرویز کا اصل مقصد یہ ہے کہ روایات کی پابندی میں جو غلو کیا جاتا ہے، اور احادیث کے مجموعوں پر جس طرح آنکھیں بند کر کے ایمان لایا جاتا ہے، یہ بھی اسی قسم کی غلطی ہے جس قسم کی غلطی فقہائے مجتہدین کی اندھی تقلید کرنے والے اور ان کے اجتہادات کو تنقید سے بالاتر سمجھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں چوہدری صاحب نے جو طریق بحث و استدلال اختیار کیا ہے اسے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا خدشہ ہے کہ وہ اس گروہ کے مسلک کی طرف جھک گئے ہیں جو بزعم خود اہل قرآن کے نام سے موسوم ہے پچھلے دنوں سفر دہلی کے موقع پر ہم نے چوہدری صاحب سے

زبانی عرض کیا تھا کہ مضمون کے اس حصہ پر نظر ثانی فرمائیں چنانچہ انہوں نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ جو مقامات راہ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں، ان کو بدل دیں گے، لیکن غالباً مشغولیت کی وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ چونکہ ان کے مضمون کا سلسلہ توڑنا مناسب نہیں ہے، اس لیے اس حصہ کو ہم مجنبہ شائع کر رہے ہیں، مگر چند امور کی توضیح ضروری سمجھتے ہیں تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ خود صاحب مضمون کے خیالات بھی اس سلسلہ میں وہی ہیں جو ہم اپنے نوٹ میں ظاہر کر رہے ہیں۔

اس سے تو کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا کہ امور دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل واجب الاتباع ہے اور قرآن کے بعد جس چیز کے ذریعہ سے ہم کو اپنے دین کا علم حاصل ہوتا ہے وہ حضور کا طریقہ ہی ہے۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ طریق نبوی کے علم کی کیا صورتیں ہیں، اور کس صورت کا دین میں کیا مرتبہ ہے۔

جو باتیں حضور سے ہم تک پہنچی ہیں ان کو دو حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جو تو اتر کے ساتھ آیا ہے، خواہ وہ تو اتر عملی ہو یا خبری۔ دوسرا حصہ وہ جو تو اتر کے ساتھ نہیں آیا ان میں سے پہلے حصہ کے متعلق تمام امت کا اتفاق ہے کہ وہ یقینی ہے، اور عقل بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے ثابت شدہ حقیقت تسلیم کرنا چاہیے، کیونکہ تو اتر کا مفید یقین ہونا مسلمات میں سے ہے۔ رہا دوسرا حصہ تو اصولاً اس کو سب ظنی مانتے ہیں۔ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ مفید علم ضروری ہے مگر اختلاف جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اس امر میں ہے کہ اس اصولی ظنیت کی بنا پر اخبار آحاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ اس مسئلہ میں تین مختلف مسلک ہیں۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ احادیث کا تمام مجموعہ ظنی ہے، اس لیے وہ من حیث الکل رد کر دینے کے قابل ہے، کیونکہ جو چیز ظنی ہے وہ ثابت شدہ نہیں اور جو ثابت شدہ نہیں لاقی اتباع نہیں مگر تقویٰ سے غور و

کے بعد اس مسلک کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی منظونات چیز ثابت شدہ نہیں ہوتی لیکن کسی چیز کا ثابت شدہ نہ ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ وہ رد ہی کر دینے کے قابل ہو؟ اگر اتباع کے لیے یقینی ہونا شرط ہے تو فرمائیے کہ ”یقینیات“ دنیا میں ہیں کتنے؟ آپ کی زندگی کے کتنے معاملات ایسے ہیں جن میں آپ صرف یقینیات کی پیروی کرتے ہیں اور منظونات کو من حیث اکل رد کر دیتے ہیں؟ تجزیہ و تحلیل کے چند ہی مدارج طے کر کے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ قاعدہ زندگی میں نہ کبھی چلا ہے نہ چل سکتا ہے۔ منظونات کو من حیث اکل قبول کر لینا جس درجہ کی غلطی ہے، اسی درجہ کی غلطی ان کو من حیث اکل رد کر دیتا بھی ہے عقل سلیم کا اقتضا یہ ہے (اور اسی کی پیروی زندگی کے تمام معاملات میں انسان کرتا ہے) کہ تمام منظونات کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے، بلکہ ان کے درمیان تمیز کی جائے، ان میں سے ہر ایک کو جدا جدا جانچ کر دیکھا جائے، اور تحقیق کے مختلف درجے سے کام لے کر یہ دریافت کیا جائے کہ کونسی چیز ”یقین“ سے کس درجہ قریب یا کس درجہ بعید ہے؟ جو چیز بعید ہو اسے رد کر دو۔ جو چیز قریب و بعد کے درمیان ہو اس میں توقف کر دو۔ اور جو چیز قریب یا اقرب ہو، اس کو بلحاظ اس کے درجہ قریب کے قبول کر لو۔ یہی اصول ہے جس پر دنیا کے سارے معاملات میں عمل کیا جاتا ہے، اور چونکہ ہمارا دین غیر معقول نہیں ہے، اس لیے اسی کی پیروی دین کے معاملات میں بھی کرنی چاہیے۔ کم از کم ہمیں تو قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملی جو اس اصول کو خلاف حق قرار دیتی ہو۔ جن آیات میں ظن پر چلنے والوں کی برائی وارد ہوئی ہے ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ظن کوئی گناہ ہے یا اس سے بالکل اجتناب واجب ہے، بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہے کہ جو ظن و تخمین، وحی کے خلاف ہو، یا جس کو وحی سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر اختیار کیا جائے وہ گمراہی کا سبب ہے۔

احادیث کو بالکل رد کر دینے سے عملاً جو خرابی واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جزئیات میں

انسان رسالت کی رہنمائی سے محروم ہو جاتا ہے، اور دین پر عمل کرنے کی یہ فیصلہ سازی صورتوں میں قیاس و رائے کا دخل اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس سے اصولی احکام کی اصل اسپرٹ کے بھی ضائع ہو جانے کا خوف ہے۔ نیز اس میں یہ بھی خطرہ ہے کہ جب تفصیلات میں سرے سے کوئی سند ہی نہ ہوگی، تو لا محالہ انفرادیت راہ پائے گی۔ ہر شخص اپنی رائے اور اپنے رجحان کے مطابق جو صورت چاہے گا اختیار کرے گا، اور کوئی ایسی قوت باقی نہ رہے گی جو تفرق و انتشار اور اختلاف و عمل کو انفرادیت کی آخری حدود تک پہنچنے سے روک سکتی ہو۔ مثال کے طور پر ایک نماز جمعہ ہی کو لے لیجئے جس پر تفصیلی بحث ابھی پچھلے مہینہ آپ کی نظر سے گزر چکی ہے۔ ہمارے پاس علم تقین کے جو ذرائع ہیں، ان میں سے پہلا اور سب سے بڑا ذریعہ یعنی قرآن ہم کو صرف اتنی ہدایت دیتا ہے کہ ”جب نماز جمعہ کے لیے بلایا جائے تو سب کام چھوڑ کر دوڑ پڑو“۔ دوسرا ذریعہ یعنی عمل متواتر ہم کو اس سے تھوڑی دور آگے لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ صرف اتنا علم ہم کو دیتا ہے کہ جمعہ کا وقت ظہر کا وقت ہے، اس کے لیے جماعت شرط ہے، اس سے پہلے خطبہ ہونا چاہیے، اس کی رکعتیں دو ہیں، اور اس کے لیے اذن عام ضروری ہے۔ ان امور کے بعد جننے علیٰ خبریات ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی قرآن یا عمل متواتر سے ہم کو معلوم نہیں ہوتی۔ اب اگر اخبار آحاد کو بحیثیت مجموعی رد کر دینے کا اصول اختیار کیا جائے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص خبریات کو اپنی رائے سے مقرر کرے گا، اور کسی رائے کو بھی کوئی ایسی اتھارٹی حاصل نہ ہوگی جس کی بنا پر اسے دوسری رائے کے مقابلہ میں ترجیح دی جا سکے اور مسلمانوں کی کسی بڑی جماعت پر اس کی پیروی لازم ہو جائے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس سے خبریات میں کتنی افراتفری برپا ہوگی نظام جماعت کو کتنا نقصان پہنچے گا، اور کس طرح بعض صورتوں میں تصادم شریعت تک ذوت ہو جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اخبار آحاد سے جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ کبھی کبھی کچھ مختلف ہیں اور ان کی بنا پر بھی متعدد مذاہب نکلتے ہیں۔ مگر اول تو ان میں شکل پانچ ستا

مذہب نکلنے کی گنجائش ہے، اور پھر ان سے جتنے مذہب بھی نکلتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو کسی بالاتر
 اقتدار کی سند حاصل ہے جس کی قوت سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس کا اتباع کرتی ہے۔
 بخلاف اس کے اخبار آحاد کو باکھلیہ رد کرنے کے بعد بے شمار مذہب کی گنجائش نکل آتی ہے، اور
 ان میں سے کسی مذہب کو بھی کوئی ایسی سند حاصل نہیں ہوتی جو زیادہ نہیں، دوہی مسلمانوں کو کسی
 ایک جزیئہ میں ایک طریقہ پر جمع کر دے۔ نتیجہ اس کا باہل ظاہر ہے۔ جمعہ کی قوت جامعہ ختم ہو
 رہ جائے گی اور اختلاف عمل اس مقصد ہی کا خاتمہ کر دے گا جس کے لیے اقامت جمعہ مندرجہ
 کی گئی ہے۔

جمعہ کو ہم نے صرف مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ ورنہ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ
 اسلام کے نظام شرعی کو جو چیز ایک مستقل عملی نظام بناتی ہے اور مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، معاشرت
 معیشت، سیاست، غرض ان کی پوری اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ کو ایک مستقل تفصیلی شکل میں
 ڈھالتی ہے وہ وہی علم ہے جو اخبار آحاد سے ہم کو حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
 پبلک اور پرائیویٹ زندگی، آپ کے اخلاق، آپ کی عادات، آپ کا طریق عبادت، آپ کا طرز
 تعلیم و تبلیغ، آپ کا طرز عدالت، آپ کے قانونی فیصلے، زندگی کے مختلف شعبوں میں آپ کی
 ہدایات اور آپ کا طرز عمل پھر آپ کے خلفاء اور صحابہ اور اہل بیت اور تابعین کے
 آثار ہی وہ چیزیں ہیں جو اسلام کی عملی زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتی ہیں، اور اسی نقشہ پر اسلام
 ایک مکمل نظام حیات بنتا ہے۔ مگر ان چیزوں کے حصول کا ذریعہ نہ قرآن ہے نہ تواتر۔ صرف اخبار
 آحاد ہی ہیں جو ہم تک معلومات اور ہدایات کا عظیم الشان ذخیرہ پہنچاتی ہیں۔ ان کو مٹا دیجیے پھر
 اسلام محض ایک ڈبا پچ رہ جائے گا جس پر گوشت پوست کچھ نہ ہوگا، جس کی شکل اور جس کے خط و
 خال کو جو شخص جس طرح چاہے گا بنائے گا۔ اس صورت میں درحقیقت کوئی ایک نظام عبادت

قائم ہی نہ ہو سکیگا، کچا کہ کوئی ایسی تہذیب وجود میں آسکے جو اسلامی تہذیب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی مخالفت آج وہی لوگ کر رہے ہیں جو دراصل اسلامی تہذیب کے نظام کو توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے تعینات کی حدود میں اپنی اھوار اور خواہشات کی پیروی کے لیے کوئی گنجائش نہیں پاتے اس لیے انہوں نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ اُس چیز ہی کو مٹا دو جو اس نظام کی حد بندی کرتی ہے پھر ہم آزاد ہو جائیں گے کہ اسلام کے ڈھانچے پر جس طرح چاہیں گوشت پوست چڑھائیں، اور جیسی چاہیں اس کی شکل بنا دیں۔

یہ لوگ احادیث کو مجموعی حیثیت سے مردود قرار دینے کے لیے ان حدیثوں کو مثال پیش کرتے ہیں جو باہم متعارض ہیں، یا جن میں انبیاء علیہم السلام پر طعن پایا جاتا ہے، یا جو عقل کے خلاف ہیں یا قرآن کے خلاف نظر آتی ہیں۔ ان نمونہ کے افراد سے یہ لوگ پورے مجموعہ کے غلط اور قابل رد ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کسی قوم کے چند افراد کی بد معاشی سے پوری قوم کی بد معاشی پر استدلال کیا جائے۔ جب ہر روایت لمجاظ متن اور لمجاظ اسناد دوسری روایت سے مختلف ہے تو ہر روایت کے متعلق جدا جدا تحقیق کر کے رائے قائم کرنی چاہیے کہ وہ قبول کرنے کے لائق ہے یا رد کرنے کے لائق۔ سب کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے لینا اور پورے مجموعہ کے متعلق ایک ہی رائے قائم کرنا کسی معقول انسان کا فعل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ لوگ احادیث پر فرداً فرداً نگاہ ڈالیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ جہاں ایک قلیل تعداد ایسی حدیثوں کی ہے جنہیں دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ حدیثیں رسول اللہ کی نہیں ہو سکتیں وہاں ایک کثیر تعداد ایسی حدیثوں کی بھی ہے جو حکمت کے جواہر سے بھرپور ہیں جن میں قانون اور اخلاق کے بہترین اصول پائے جاتے ہیں، جو اسلام کی حقیقت اور اس کے مصالح و حکم پر بہتر روشنی ڈالتی ہیں اور جن کو دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ایک رسول ہی کی حدیثیں ہو سکتی ہیں۔ پھر اگر

یہ لوگ متق پرست اور انصاف پسند ہوتے ہیں نظر آئے کہ محدثین کرام نے عہد رسالت اور عہد صحابہ کو اخبار و آثار جمع کرنے اور ان کو چھاننے اور ان کی حفاظت کرنے میں مختصر کی ہیں جو دنیا کے کسی گروہ نے کسی دور کے حالات کے لیے نہیں کیں۔ انہوں نے احادیث کی تنقید و تنقیح کے لیے جو طریقے اختیار کیے وہ ایسے ہیں کہ کسی دور گذشتہ کے حالات کی تحقیق کے لیے ان سے بہتر طریقے عقل انسانی نے آج تک دریافت نہیں کیے۔ تحقیق کے زیادہ سے زیادہ معتبر ذرائع جو انسان کے امکان میں ہیں وہ سب اس گروہ نے استعمال کیے ہیں اور ایسی سختی کے ساتھ استعمال کی ہیں کہ کسی دور تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ درحقیقت یہی چیز اس امر کا یقین دلاتی ہے کہ اس عظیم الشان خدمت میں اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق شامل حال ہی ہے، اور جس خدا نے اپنی آخری کتاب کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا ہے، اسی نے اپنے آخری نبی کے نقوش قدم اور آثار ہدایت کی حفاظت کے لیے بھی وہ انتظام کیا ہے جو اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

یہ تو اس گروہ کا حال تھا جو احادیث کی اصولی ظہنت کی بنا پر انھیں باکھلیہ رد کر دینا چاہتا ہے۔ اب دوسرے گروہ کو لیجیے جو دوسری انتہا کی طرف گیا ہے۔ یہ لوگ محدثین کے اتباع میں جائز حد سے زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک ایک حدیث کو چھانٹ کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابل اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابل اعتبار۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور محبت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الائنہ ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کر گئے ہیں اس سے بالکل استناد نہ کریں، ان کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر مانیں، روایت کے حدل اور ضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آراء کا وہ اظہار کر گئے ہیں ان پر گویا ایمان لے آئیں، ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار

ہے ٹھیک ٹھیک اسی معیار کی ہم بھی پابندی کریں، مثلاً مشہور کوشاڈ پر، مروع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں، اور ان کی پچھی ہوئی حد سے یک سر مو تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی مخالفت جناب پرویز کرنا چاہتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی مخالفت بالکل جائز ہے۔

محدثین جبہم اللہ کی خدمات مسلم۔ یہ بھی مسلم کہ نقد حدیث کے لیے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہر حال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لیے جو حدیث فطرۃ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جاسکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ زیادہ ہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظن غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ لمجاظ روایت تھا کہ لمجاظ درایت۔ ان کا نقطہ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع ہی نہ تھا، اس لیے فقہانہ نقطہ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے کمال کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انہوں نے کی ہے اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک لمجاظ اسناد، دوسرے لمجاظ تفسیر۔

اس مطلب کی توضیح کے لیے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے۔ کسی روایت کو جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔ اس سلسلہ میں متعدد حیثیات سے ایک ایک ادوی کی جانچ کی جاتی ہے۔ وہ مجھوٹا تو نہیں ہے؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور

بدعتیہ تو نہیں؟ وہی یا ضعیف المحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال ہے یا معروف الحال؟ ان تمام حیثیات سے روایت کے احوال کی جانچ پڑتال کر کے محدثین کرام نے اسرار الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا ہے جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر اس میں کوئی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔

اول تو روایت کی سیرت اور ان کے حافظ اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل۔ دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے، انسانی کمزوریوں سے بے برائے تھے۔ نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا، اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بُری رائے قائم کرنے میں ان کے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض امکانِ عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بار بار یہ امکان نفل میں آچھا ہے۔

حماد جیسے بزرگ تمام علمائے حجاز کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ”ان کے پاس علم نہیں تھا ہر بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔“ عطاء اور طاؤس اور مجاہد جیسے فضلاء کے حق میں بھی ان کی یہی رائے ہے۔ یہ حماد کون ہیں؟ امام ابو حنیفہ کے استاد اور ابراہیم النخعی کے جانشین۔ امام زہری کو دیکھیے۔ اپنے زمانہ کے اہل مکہ پر یما رکرتے ہیں ما را ایت قومًا نقض لعری الاسلام من اهل مکة۔ حالانکہ مکہ اس وقت حلیل القدر علماء و صلحاء سے خالی نہ تھا۔ شبلی اور ابراہیم النخعی دونوں بڑے درجہ کے لوگ ہیں۔ مگر ایک دوسرے پر کس طرح چوٹ کرتے ہیں۔ شعبی کہتے ہیں کہ ابراہیم النخعی رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور صبح لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے بیان کرتا ہے۔ ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ ”وہ کذاب مسروق سے روایت کرتا ہے حالانکہ مسروق سے وہ ملائک نہیں۔“ ضحاک گو دیکھتے

ایک مرتبہ اپنی بات کی تصحیح میں آکر صحابہ کرام کے متعلق کہہ گئے کہ ”ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں“ سعید بن جبیر جیسے محتاط بزرگ ایک مسئلہ میں شعبی پر جھوٹ کا الزام رکھتے ہیں اور حکمہ کے حق میں اپنے غلام سے کہتے ہیں کہ لا تکذب علی کما کذب عکرمہ علی ابن عباس۔ امام مالک کی حلا

شان دیکھیے اور محمد بن اسحاق جیسے شخص کے حق میں ان کا یہ فرمانا دیکھیے کہ ذلک دجال
المدجا جلد ۳ سے بڑھ کر عجیب یہ کہ وہ تمام علماء عراق پر سخت طعن کرتے ہیں اور ان کے
حق میں فرماتے ہیں کہ انزلو ہمد منزلة اهل الكتاب لا تصدقو ہمد ولا
تکذبو ہمد۔ امام ابو حنیفہ کس قدر جلیل القدر اور محتاط فقیہ ہیں۔ اعمش کے حق میں فرماتے ہیں
کہ اس نے کبھی نہ رمضان کا روزہ رکھا نہ غسل جنابت کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اعمش الماء من
کے قائل تھے اور حدیث کی مطابق سحری کیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن المبارک کس پایہ
کے ثقہ بزرگ ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر بھی ضد نے غلبہ کیا اور امام مالک کے حق میں ان کے منہ
سے یہ الفاظ نکل گئے کہ ”میں اس کو عالم نہیں سمجھتا“۔ یحییٰ بن معین نے تو بڑے بڑے ثقات پر چوٹیں
کی ہیں۔ زہری، اوزاعی، ابو عثمان التھمدی، طاوس غرض اس عہد کے متعدد بڑے بڑے لوگوں
پر وہ طعن کر گئے ہیں، حتیٰ کہ امام شافعی تک کے حق میں انہوں نے کہا کہ لیس بثقة۔ ان
سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا
غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔ ابن عمر نے سنا کہ ابو ہریرہ وتر کو
ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے کہ ابو ہریرہ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہ نے ایک موقع پر انس اور
ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول اللہ کو کیا جانتے ہیں۔ وہ تو اس زمانہ
میں بچے تھے۔ حضرت حسن بن علی سے ایک مرتبہ دَسَّاهِدٌ وَ مَشْهُوْدٌ کے معنی پوچھے گئے انہوں
نے اس کی تفسیر بیان کی۔ عرض کیا گیا کہ ابن عمر اور ابن الزبیر تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا دونوں
جھوٹے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیا۔ عبادہ بن
الصامت نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعود بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا،
حالانکہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسما و الرجال کا سارا علم غلط ہے بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو انبیاء و صحابہؓ کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو، اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو۔ اور اس کی تمام روایتیں پایہ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظ اور نیک نیتی اور صحت ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو اور بھی مشکل ہے، اور ان سب سے زیادہ مشکل یہ تحقیق کرنا ہے کہ ہر راوی نے ہر روایت کے بیان میں ان تمام جزئیات کو ملحوظ بھی رکھا ہے یا نہیں جو فقہانہ نقطہ نظر سے استنباط مسائل میں اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ تو فن رجال کا حال ہے۔ اس کے بعد دوسری اہم چیز سلسلہ اسناد ہے۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے آیا وہ اس کا ہم مصر تھا یا نہیں، ہم عصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں، اور ملا تھا تو آیا اس نے یہ خاص حدیث خود اسی سے سنی یا کسی اور سے سنی اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ان سب چیزوں کی تحقیق انہوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے، مگر لازم نہیں کہ ہر مرتبہ کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو اور انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا ہو کہ بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مُرسل یا معضل یا منقطع ہیں، اور اس بنا پر پایہ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں ان میں سے بعض ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ایسے ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو

کلینتہ صحیح نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثارِ صحیحہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے، مگر اس قابل نہیں کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، محدثین جمہم اللہ کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق بلحاظ روایت کرنا تھا، اس لیے ان پر اخباری نقطہ نظر غالب ہو گیا تھا، اور وہ روایات کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں زیادہ تر صرف اسی چیز کا لحاظ فرماتے تھے کہ اسناد اور رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہیں۔ رہا فقہانہ نقطہ نظر تو وہ ان کے موضوع خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا، اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا، اور وہ روایات پر اس حیثیت سے کم ہی نگاہ ڈالتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے حالانکہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں۔ اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالانکہ معنی "وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اس موقع نہیں کہ شاملین دے کر تفصیل کے ساتھ اس پہلو کی توضیح کی جائے۔ مگر جو لوگ علومِ بشریہ میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطہ نظر بکثرت مواقع پر فقہانہ نقطہ نظر سے ٹکرایا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ توازن اور اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہاء مجتہدین نے ملحوظ رکھا ہے۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جس طرح حدیث کو باکلیہ رد کر دینے والے غلطی کرتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی سے محظوظ نہیں ہیں جنہوں نے حدیث سے استفادہ کرنے میں صرف روایات ہی پر اعتماد کر لیا ہے۔ مسلک حق ان دونوں کے درمیان ہے، اور یہ وہی مسلک ہے جو ائمہ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے

ہیں جو مزمل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں، یا جن میں ایک قوی الا سناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الا سناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے، یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں یہی حال امام مالک کا ہے۔ باوجودیکہ اخباری نقطہ نظر ان پر زیادہ غالب ہے، مگر پھر بھی ان کے نفع نے بہت سے مسائل میں ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتویٰ دینے پر مجبور کیا جنہیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں چنانچہ لیبث بن سعد نے ان کی نفع سے تقریباً سٹلے اس نوعیت کے نکالے ہیں امام شافعی کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ معاذ اللہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ لوگ کسی حدیث کو حدیث صحیح جان کر اس سے انحراف کرتے تھے نہیں بلکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک صحت حدیث کا مدار صرف اسناد پر نہ تھا۔ اسناد کے علاوہ ایک اور کوئی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے، اور جس حدیث کے متعلق ان کو اطمینان ہوتا تھا کہ یہ حقیقت سے اقرب ہے اسی کو قبول کر لیتے تھے خواہ وہ خالص محدثانہ نقطہ نظر سے مروج ہی کیوں نہ ہو۔

یہ دوسری کوئی کونسی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارہ اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں جس شخص کو اللہ تعالیٰ نفع کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسول کے فائدہ مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جوہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس ذوق کا مالک اسلام کا مزاج شناس ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس کی نظر پر حقیقت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سٹم پر ہوتی ہے، اور وہ اس سٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے،

تو ان میں بھی یہی کوئی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذات نبوی کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے، اور کونسی چیز سنت نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی، ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلان مثلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لیے کہ اس کی روح، روح محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اس کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اس سے مدد ضرور لیتا ہے، مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، ملعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لیے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر میرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل اسند، مقبول حدیث سے بھی عرا کر جاتا ہے، اس لیے کہ اس جام زرین میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

یہ چیز چونکہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی، نہ آسکتی ہے اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے ہی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ چنانچہ اسی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان جرح و بیہتان میں بکثرت اختلافات ہوئے ہیں پھر یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک شخص کا ذوق لا محالہ دوسرے شخص کے ذوق سے کلیتہً مطابق ہی ہو یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ملک کے ائمہ نے بہتے مسائل میں ایک دوسرے کا اختلاف کیا ہے امام ابو حنیفہ

اور ان کے اصحاب کے اقوال میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اس کی ایک ڈسٹنشن ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مجتہد کا ذوق ہر مسئلہ میں صواب ہی کو پہنچ جائے۔ انسان بہر حال کمزوریوں کا مجموعہ ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا مجتہد بھی غلطی کر سکتا ہے اور کر جاتا ہے اسی بنا پر ائمہ مجتہدین ہمیشہ ڈرتے رہے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اپنے متبعین کو یہ ہدایت کی ہے کہ ہم پر بالکل اعتماد نہ کرو۔ خود بھی تحقیق کرتے رہو اور جب کوئی سنت ہمارے قول کے خلاف ثابت ہو جائے تو ہمارے قول کو رو کر کے سنت کی پیروی کرو۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ لا یجمل لاحد ان یقول مقاتلتنا حتی یعلم من این قلنا۔ امام زفر کا قول ہے انما نأخذ بالرأی ما لم نجد الاثر فاذا جاء الاثر تركنا الرأی و اخذنا بالاثر۔ امام مالک کا ارشاد ہے انما انما بشرنا خطی و اصیب فانظر وانی رأی فكلما وافق الكتاب و السنة فخذ و و كلما لم یوافق الكتاب و السنة فاتركه امام شافعی کا بیان ہے کہ اذا صح الحدیث فاضر یوایقولی الحائط اور لا قول لاحد مع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ غرض یہ کہ تمام ائمہ بالاجماع کہتے ہیں کہ جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنت رسول روشن ہو جائے اس کے لیے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے، خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔

نوٹ

[یہ استدراک یہاں تک پہنچ چکا تھا اور اس کا ایک معتد بہ حصہ پریس بھی جا چکا تھا

کہ جناب پرویز کا عنایت نامہ وصول ہوا جس میں انہوں نے جب وعدہ اپنے مدعا کی توضیح

فرمادی ہے۔ ان کی خواہش کے مطابق سطور ذیل کو ان کے مضمون کے تتمہ کی حیثیت

سے درج کیا جاتا ہے]

”میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ تصریحات بالا سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں اُس گروہ کے مسلک کی تائید کر رہا ہوں جسے عام طور پر منکر بن حدیث یا اہل قرآن کہا جاتا ہے میں اس سے پیشتر اپنے متعدد مضامین میں اس حقیقت کو بے نقاب کر چکا ہوں کہ اس فرقہ کو رسول کی حیثیت کے تعین میں سخت ٹھوکر لگی ہے۔ وہ اس لم سے چشم پوشی کر رہے ہیں کہ قرآن کریم میں کیوں حصہ کے ساتھ ارشاد ہے کہ ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنایا۔ ان کے نزد اگر قرآن کلمے کی چھت سے لکھا دیا جاتا یا کسی چٹان پر منقوش لجا تا تو بھی ایسا ہی تھا جیسا رسول عربی کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ رسول کی حیثیت ان کے نزدیک ادا ابلاغ سے زیادہ نہیں۔

مشدوفی الحدیث طبقہ اگر اس افراط کی طرف چلا گیا کہ ہر قول منسوب الی الرسول کو قول رسول قرار دیکر واجب الاتباع تسلیم کرنے لگا تو دوسری طرف یہ اہل قرآن ہونے کے مدعی اس قدر غلطی میں جا گرے کہ عمل رسول کو جو امت کے لیے اسوۂ حسنہ ہے ایک بیکار محض سمجھ کر قرآن کریم کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی جولا نگاہ بنانے لگے۔ یہ بحث کہ تو اتر کیا ہے، یہ کس طرح یعنی ہے، آج تو اتر میں جو جزئی اختلافات پیدا ہو چکے ہیں ان کی وجوہات کیا ہیں، اور ان کی حیثیت کیا ہے، وغیرہ وغیرہ، یہ ایک جداگانہ موضوع ہے اور بتوفیق باری تعالیٰ اس کی تشریح ایک الگ مضمون میں کر دی جائے گی۔ اس مقام پر صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ روایات کے متعلق جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کو ہمیشہ قرآن کے تابع رہنا چاہیے کیونکہ جس نہج و اسلوب سے روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ ظنی ہے یقین نہیں ہے۔ برعکس اس کے قرآن یقینی ہے۔ اور جس کوئی پر روایات کو پرکھا گیا ہے وہ بجائے خوش ظنی ہے۔ قرآن کی روشنی میں احادیث کو پرکھا جاتا تو بڑی حد تک ان پر عقما کیا جاسکتا تھا۔ باقی رہا اسوۂ حسنہ تو رسول پر ایمان کا مفہوم ہی یہی ہے کہ اس کو واجب الاتباع سمجھا جائے۔“